تعلیمی پالیسی، زبان اور ثقافت

طارق جان

ہماری قومی زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں سے ایک بہت الجھا ہوا مسئلہ ذریعہ تعلیم کا ہے۔ ملکی اور قومی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر تعلیمی پالیسی بنائی جاتی، اور یکسوئی سے اس پر عمل کیا جاتا، تو ہماری تعلیمی پیش رفت نہایت تیز رفتار ہوتی لیکن تضاد اور کشمکش سے توانائیاں ضائع ہو رہی ہیں۔ ہر قومی تعلیمی پالیسی میں ذریعہ تعلیم کے طور پر زبان کے کردار کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے، اور انگلش میڈیم اداروں کو جواز فراہم کیا گیا ہے، جو قوم کو طبقات میں تقسیم کرتے ہیں۔ یقیناً ہمارے پالیسی ساز ثقافت کی تشکیل میں زبان کے کردار کا شعور نہیں رکھتے۔

زبان کیا ہے؟ کیا یہ مخفی خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے؟ یا یہ ایک ایسا اہم وسیلہ ہے جس کے ذریعہ ایک مخصوص ثقافت کی اقدار کو منتقل کیا جاتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا یہ ایک بے جان اور بے قیمت چیز ہے، یا یہ کسی قوم کی ثقافتی اقدار، قومی مزاج اور نظریات کی حامل ہے؟

اگر تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زبان، بہ یک وقت خیالات کے اظہار کا ذریعہ اور ثقافتی اقدار اور قومی مزاج کی حامل بھی ہے، تو پھر سوال یہ ہے کہ (انگلش کو ذریعہ تعلیم ماننے کی صورت میں) آپ ہماری نوجوان نسل کو اس انگریزی ثقافت سے کیسے بچائیں گے، جو کہ انگریزی زبان کے ہم رکاب ہے، جو انگریزی کے قالب میں روح کی طرح بستی ہے۔

پوری تاریخ انسانی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے کوئی غیر ملکی زبان قبول کی ہو اور اس کے ثقافتی عناصر سے بچی رہی ہو۔ دراصل کسی زبان کو اس کے مخصوص ثقافتی اثرات سے پاک کرنے کے لیے کوئی آلہ ہے ہی نہیں۔ یہ امرِ واقعہ ہے کہ غیر ملکی زبان قبول کرنے والی قوم کو اس زبان کے ثقافتی عناصر کو قبول نہ کرنے کا قطعاً اختیار نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ جب زبان کے بھیس میں اَغیار کی ثقافت قبول کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے، تو

اس ثقافت کی طرف سے روز بروز اپنے آپ کو مستحکم کرنے کا عمل خود بخود شروع ہو جاتا ہے۔ نووارد زبان اپنے نئے قبول کرنے والوں میں، اپنی شناخت، اپنے سے وفاداری، اور اپنے عالمی نقطۂ نظر سے وابستگی کے ایسے مقناطیسی مراکز پیدا کرتی ہے، جس کے ذریعے وہ اس نئی قوم کے رشتے اصل اہل زبان سے جوڑ دیتی ہے۔ اس تناظر میں ہر قومی تعلیمی پالیسی ایک ایسا نشہ اور ایک ایسا عملِ جراحی ہے، جس کے ذریعے اس مرکزی نس کو کاٹ پھینکنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمیں مسلم دنیا سے جوڑتی ہے۔ درحقیقت اپنی ان خصوصیات کی بنا پر ہماری قومی تعلیمی پالیسی دراصل استعماری سوچ کی حامل رہی ہے۔

زبان کا مسئلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بیک وقت کئی زبانوں "اردو، انگریزی، اور صوبوں میں علاقائی زبانوں اور پرائمری تک مادری زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دینے نے ہمارے پہلے سے نازک قومی ڈھانچے میں انتشار پسند تخریبی قوتوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ یہ عمل علاقائیت کو پروان چڑھانے، حتیٰ کہ مختلف لسانی گروپوں کی طرف سے اپنا علیحدہ تشخص قائم کرنے کے عمل کو تقویت دے رہا ہے۔ اگر اس حقیقت سے چشم پوشی بھی کر لی جائے تو، کیا یہ کم ہے کہ یہ عمل ایک ہی علاقائی یونٹ میں مختلف لسانی گروپوں کے درمیان لسانی روابط اور باہمی ابلاغ میں رکاوٹوں کا باعث بن جائے گا۔ کیونکہ صحیح بنیادوں پر لسانی گروہ بندی نہیں ہو سکتی ہے، بلکہ ایک ہی صوبے میں لوگ ایک سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گی، جو قومی اتحاد و یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے میں انتہائی مدد گار ہو گی۔ اور بلاشبہ یہ صورتحال گذشتہ ۴۵ سال میں حاصل کی گئی جو چند کامیابیاں ہیں، ان پر پانی پھیر دے گی، اور ہماری قومی حیثیت کو تباہ و برباد کر دے گی۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ بیک وقت تین زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا عمل ہمارے معاشرے میں ناخواندگی کی شرح کو بڑھانے کا باعث ہو گا۔ اسے آپ رجعت قہقری بھی کہہ سکتے ہیں، اور بھونڈے مذاق پر مبنی احمقانہ عمل بھی۔ مثال کے طور پر ایک بچہ جس نے پانچویں جماعت تک سندھی یا بلوچی زبان میں تعلیم حاصل کی ہے، وہ اردو نہیں پڑھ سکے گا۔ اسی طرح جس بچے نے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی ہو گی، وہ بھی اردو پڑھنے کے قابل نہیں ہو گا۔ انھی پر اردو میڈیم سکولوں میں پڑھنے والے بچے کو قیاس کر لیجیے کہ وہ سندھی اور انگریزی پڑھنے کے قابل نہیں ہو گا ۔ یہ تینوں تین مختلف قسم کی ناخواندگی کا شکار ہوں گے۔ اب بتایا جائے کس بچے کو خواندہ کہا جائے گا؟ کسی کو بھی نہیں، کیونکہ خواندگی کا یہاں ایک متفقہ معیار ہے ہی

نہیں۔

تمام دنیا میں، اور خاص کر مغرب میں، ثانوی تعلیم کو ایک قدامت پسندانہ عمل سمجھا جاتا ہے، جس کے ذریعے نوجوانوں کو سوسائٹی کی اقدار، معاشرتی طور پر مُسلّمہ سچائیوں اور پسندیدہ رویّوں کی تعلیم کے ذریعے مہذب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انھیں ہر طرح کے متنازعہ امور سے الگ رکھا جاتا ہے، کیونکہ یہ معاشرتی ابتری اور سماجی عدم مطابقت کو جنم دیتے ہیں۔ انھیں انفرادیت کی تعلیم، بعد میں صرف اس وقت دی جاتی ہے جب ان کی شخصیت سازی کرتے وقت انھیں مخصوص بندھنوں میں رہنے اور سوچنے کا پابند بنایا جا چکا ہوتا ہے۔ لیکن یہاں ہمارے ہاں انگلش میڈیم اسکولوں کے ذریعہ بچے ابتدا ہی سے معاشرہ کے اندر موجود مُسلّمہ حقیقتوں سے معرکہ آرائی کے عمل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

چند ماہ بیشتر میں نے انگلش میڈیم اسکولوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ کیا۔ اپنے اس مطالعے اور تجزیے کے سلسلے میں، میں نے دس سوال ترتیب دیے، جن کے جوابات طلبہ سے حاصل کرنا تھے۔ اس تجزیاتی مطالعے کا مقصد انگلش میڈیم اسکولوں کے طلبہ پر ان اسکولوں کے ثقافتی اثرات کا جائزہ لینا تھا۔

اس تجزیہ کی رُو سے ایسے اسکولوں کے ۵۵ فیصد طلبہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں رہنا نہیں چاہتے۔ کچھ سکولوں میں تعلیم کی تکمیل کے بعد پاکستان میں قیام کی خواہش نہ رکھنے والے ان طلبہ کی اوسط ۶۶ فیصد تھی۔ صرف ۷ فیصد طلبہ اقبال کو پڑھ سکتے ہیں، جبکہ ان سے بھی کم تعداد ایسے بچوں کی بھی ہے جو اقبال کو سمجھ سکتے ہیں۔ ۵۸ فیصد طلبہ انگریزی ناول اور افسانہ پڑھتے ہیں جبکہ صرف ۱۴ فیصد نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں قیام کے خواہشمند طلبہ اور نماز ادا کرنے والے طلبہ میں ایک بامقصد قسم کی ہم آہنگی اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں، ادا کی جانے والی نمازوں کی تعداد غیر اہم اور بے معنی رہی۔ بلکہ مشاہدے میں یہ آیا کہ جو طلبہ مہینے میں صرف ایک نماز ہی ادا کرتے ہیں وہ بھی مغربی ملکوں کے بجائے پاکستان میں قیام کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ اس سارے مسئلہ کا ایک انوکھا اور عجیب پہلو ہے۔

اس کے بعد جب میں نے طلبہ کی بیرونی ممالک میں قیام میں خواہش پر پوری توجہ مرکوز کی، تو مجھے شدید قلبی اذیت پہنچی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق چالیس سے پچاس ہزار طلبہ انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اور یہ تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اوسطاً ۵۰۰

روپیہ ماہانہ ٹیوشن فیس ادا کی جاتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ تقریباً تین سو ملین روپیہ کی سالانہ سرمایہ کاری پاکستان کے مستقبل کی نسل پر ہو رہی ہے۔ یہ تمام ان بااثر لوگوں کے بچے ہیں جو کہ بہترین رہائشی علاقوں میں رہتے ہیں۔ انھیں گاڑیوں میں ان کے اسکولوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان کی جیبوں میں پیسے بھی ہوتے ہیں، اور انھیں کھانے کی ہلکی پھلکی غذا (Snacks) بھی ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب کبھی یہ روتے ہوں گے تو ان کے والدین ان کے آنسو صاف کرنے کو موجود ہوتے ہوں گے۔ یہ بااثر لوگوں کے ایسے بچے ہیں جن کے ساتھ پاکستان نے کوئی برائی نہیں کی۔ ان کا استحصال بھی نہیں کیا گیا، بلکہ دراصل ان کا تعلق استحصالی طبقوں سے ہے، اور اس سب کچھ کے باوجود یہ پاکستان سے نفرت کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں اثر و نفوذ کے وجود اور جذبہ حب الوطنی اور اسلامی اقدار کے احترام کے فقدان کا یہ ایک عجیب و غریب اجتماع ہے۔ یہ ایک ایسے "مستقبل" کا عکس ہے کہ جس پر، مجھے یقین ہے، آپ کو کسی قسم کا کنٹرول حاصل نہیں ہو گا۔ اور وہ اس لیے کہ آپ "حال" کو کنٹرول نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ بدشکل حال ہمارے مایوس کن مستقبل کی نشان دہی کر رہا ہے۔

درج بالا تجزیے کے یہ المناک نتائج ایک ایسے مستقبل کا عکس پیش کر رہے ہیں، جس میں سب کچھ تہہ و بالا ہو جائے گا۔ مردوں اور عورتوں کی ایک ایسی فوج منظرعام پر آئے گی، جو اپنی قوم کی بجائے اغیار کی خدمت کرے گی۔ جو اپنے آپ سے نفرت کرے گی اور مغربی تصورات کے خوابوں میں گم رہے گی۔ وہ مغربیت کے لیے ہر اچھی چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہو گی۔ وہ اپنی قوم کو دنیا کی حقیر ترین مخلوق کی حیثیت سے دیکھے گی۔

ماضی قریب (۱۹۹۲) میں منظرعام پر آنے والی ایک کتاب:

Voices Wihtin : Dialogue with Women on Islam ان خواتین کی فکری کیفیت کی صحیح عکاسی کرتی ہے، جنھوں نے انگریزی میڈیم سکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ درج ذیل سوال جواب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طریقے سے ان کی ذہنی اور فکری بالیدگی کے عمل کو تہہ و بالا کر دیا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک خاتون سے کتاب کی ایڈیٹر چند سوالات کرتی ہے:

سوال : لیکن قرآن اللہ تعالٰی کا کلام ہے؟

فرح : مجھے معلوم نہیں، مجھے یقیناً معلوم نہیں۔

سوال : شاید (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) ایک سماجی مصلح تھے؟

فرح : یہ ٹھیک ہے...

سوال : آپ کے خیال میں قرآن کے بارے میں کونسی چیز آپ کو پریشان کرتی ہے؟ کیا جو کچھ آپ قرآن میں پڑھتی ہیں وہ آپ کی پریشانی کا باعث بنتا ہے؟

فرح : نہیں بلکہ میری پریشانی کا باعث وہ قوانین ہیں، جو قرآن میں موجود ہیں۔

ایک خاتون مسلمہ کے خیال میں مذہب کی تخلیق سیاسی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ یہ خاتون اسلام کو متعصبانہ صنفی نقطہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے "اسلام کی نشوونما پدر شاہی معاشرہ میں ہوئی ہے اور اس (اسلام) نے پدر شاہی معاشرہ کو مستحکم کیا . . . . قرآن کے متعلق یہ خاتون کہتی ہیں "جب بھی میں نے قرآن کو پڑھا اس کے تحکمانہ انداز بیان نے مجھے پریشان کیا۔ چنانچہ قرآن کے خدا کا میرے لیے کوئی وجود نہیں ہے۔ (بحوالہ بالا صفحہ ۱۴۶ - ۱۶۰)

کیا یہ ایک ایسی نادر رَوِش ہے جس کے پیچھے کوئی محرک نہیں ہے؟ یا پھر یہ ایک ایسی رَوِش ہے جس کی مکمل سرپرستی اور آبیاری کی جا رہی ہے، تاکہ مطلوب نتائج حاصل کیے جائیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کے جوابات جاننا، اس دنیا کو سمجھنے کے لیے جس میں ہم رہتے ہیں اور ان کار پردازوں کو سمجھنے کے لیے جو اس سارے عمل کے ہدایت کار ہیں، بہت ضروری ہے۔

۱۹۷۳ میں جاری ہونے والے آسپن انسٹیٹیوٹ (Aspen Institute) کی ایک مطالعاتی رپورٹ میں، ڈاکٹر لیونارڈ مارکس (Leonard Marks) کہتے ہیں :

> براہ راست مواصلاتی سیارے کے قابل عمل ہونے سے بہت سے بین الاقوامی الیکٹرانک نشر گاہوں کے سلسلے وجود میں آئیں گے، جو ثقافتی استحکام اور اطلاعات کے بہاؤ سے متعلق حقیقت پسندانہ سوالات پر توجہ مرکوز کریں گے۔ بین الاقوامی سطح پر الیکٹرانک نشر گاہوں کی توسیع کا قابلِ لحاظ تک، دوسری کسی چیز کی بجائے قوموں کی ثقافتوں پر زیادہ اثر ہو گا۔ ہماری حکمتِ عملی میں اس حقیقت کو بھی لازمی طور پر پیش نظر رکھنا ہو گا۔

انہوں نے اپنی اسی رپورٹ میں یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ "مواصلات سے متعلق ٹیکنالوجی پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے"۔

میں نے تعلیمی پالیسی کے انتہائی اہم رخ کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ استعماریت (Colonialism) اب قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ ایسا کہنے والے اس تلخ حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ نو آبادیاتی نظام کبھی بھی مکمل طور پر رخصت نہیں ہوتا۔

درحقیقت مواصلاتی نظام میں برپا انقلاب کے توسط سے استعماریت تسلط اور غلبے کے ایک نئی شکل میں سامنے آئی ہے۔ ہربرٹ شلر (Herbert Schiller) کے بقول "استعمار کے مراکز قوت دوبارہ مجتمع ہو گئے ہیں۔ استعمار کے استحصالی ذرائع بدل گئے ہیں اور استعمار کی تنظیم اور تسلط کے طریقے بھی بدل گئے ہیں"۔ ہربرٹ ہی کے بقول "اس نئی صورتحال میں امریکا کو مرکزی مقام حاصل ہے جس کے تصوراتی اور ثقافتی افکار و مظاہر مجموعی طور پر اس نئے (استعماری) نظام بیداری کے ایک ہمہ گیر اور نئے ڈھانچے کو تشکیل دیتے ہیں"۔ ایک نہایت ہی پیچیدہ طریقۂ کار وضع کر لیا گیا ہے، جس کے ذریعے فوجی طاقت کے بغیر دنیا کو دوبارہ فتح کیا جا رہا ہے۔ ہربرٹ شلر کے مطابق "اس نئے کھیل (Game) کا نام تجدیدیت (Modernization) ہے۔ مغربی استعمار کے اس نئے حملے میں ہراول دستے کا کردار امریکی تجارت کا ہے، جسے ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے نام سے پکارا جاتا ہے، یہ کارپوریشنیں اپنے اس نوآبادیاتی کردار کی انجام دہی میں اپنے تجارتی انتظامات، مالیات، مالیاتی اداروں، اقتصادی سرگرمیوں اور ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کرتی ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی ہی ہے (جس کے وسیع تر مفہوم میں تنظیمی ڈھانچے، ادارتی پیشوائی اور مشینری اور ساز و سامان وغیرہ شامل ہیں۔) جو اطلاعات و ابلاغ کے بنیادی طریقوں کا تعین کرتی ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ، (Mass Media) پریس، ریڈیو اور ٹیلیویژن اسی پیغام کو جمہور تک پہنچاتی ہے جس کو یہ نیا نظام پہنچانا چاہتا ہے"۔

میں اس سارے قصے کو لے کر کیوں بیٹھ گیا؟ اس لیے کہ انگریزی زبان بقول شلر "اس ثقافتی امپیریلزم کی مشترکہ زبان (Lingua Franca) ہے"۔ چنانچہ نئی تعلیمی پالیسی مسلم فکر کو مغرب کے لیے غیرارادی طور پر دوبارہ فتح کرنے کا ایک ہتھیار ہے۔

اگر میں اپنی بات آپ تک پہنچانے میں کامیاب رہا ہوں تو شاید آپ اب تک دھوکہ دہی کے ان طریقوں کو جان گئے ہوں گے، جنہیں ہمارے حکمران طبقے عوام کو بیوقوف بنا کر اپنے سامراجی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

یہ کہنا کہ "انگریزی" سائنس کی زبان ہے اس لیے ہمیں سیکھنا ہے، بیکار اور فضول بات۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو جاپان، کوریا اور چین نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ناقابل یقین حد تک پیش رفت نہ کی ہوتی۔